N 2186/57 Regd. No. A. 923

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

# ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۴ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ جنوری ۶۲ء

پروفیسر سید احتشام حسین

## امیر خسرو اور حافظ محمود شیرانی

ابھی ایک ضرورت سے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" دیکھ رہا تھا کہ ایک ایسی چیز پیش نظر ہوئی جس کی جانب ارباب تحقیق کو متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوا۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ابھی تیس چالیس سال قبل تک خالق باری کی تصنیف امیر خسرو سے منسوب کی جاتی تھی اور اس کے متعلق کسی غیر معمولی قسم کے شک کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب مولوی محمد امین چریا کوٹی نے کلیات خسرو کی ترتیب اور تدوین کے سلسلے میں جواہر خسروی مرتب کر کے علی گڑھ سے شائع کی تو خالق باری کو ان کے ہندی اردو کلام میں شامل کر لیا اور اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کے مصنف کے متعلق کوئی تفصیلی بحث کریں لیکن اس کے چند سال بعد شیرانی مرحوم نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی اور حفظ اللسان (خالق باری) کو ایک اور خسرو کی تصنیف بتا کر یہ ثابت کیا کہ یہ خسرو جہانگیری عہد کا کوئی غیر معروف شاعر ہے، امیر خسرو سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس وقت اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہو سکتی ہے یا نہیں، شیرانی مرحوم کی ایک دلیل کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

محمود شیرانی نے مولوی محمد امین چریا کوٹی کی جواہر خسروی میں شامل کی ہوئی خالق باری کو امیر خسرو کی جانب منسوب کرنے کی غلطی کے سلسلے میں جو دلائل دئے ہیں ان میں تیسری دلیل یوں ہے :-

(۳) - (مولوی محمد امین چریا کوٹی لکھتے ہیں کہ) "اس میں شک کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے اور یہ شائبۂ شک بھی خود خالق باری کے مقطع یعنی آخری شعر کو دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے جس میں لفظ خسرو موجود ہے اور جس شاعرانہ شوخی و فصاحت کے ساتھ یہ مقطع میں واقع ہوا ہے اور اس پر درویشانہ انکسار کا طرہ دیکھ کر نا ممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص نہ سمجھے اور صرف ایک لفظ با معنی مثل دیگر الفاظ با معانی کے، جن سے خالق باری بھری ہوئی ہے" قرار دے۔ وہ شعر یہ ہے :-

مولوی صاحب مہربان پناہ  گدا بھکاری خسرو شاہ

"اس کی ترکیب بالکل وہی ہے جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے" :

یہ الفاظ مولانا چریا کوٹی کے تھے، انھیں نقل کر کے شیرانی مرحوم نے یہ عبارت لکھی ہے :-

"مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے۔ اہل اللہ میں سادات نے اپنے نام سے پہلے یا بعد میں شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ ۸۳۴ھ ہجری، شاہ میاں جی ۹۹۹ھ اور سید حامد راجی شاہ ۸۴۹ھ ہجری وغیرہ۔ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لا کر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے اور نہ ان کے زمانے میں فقرا کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اول ہے جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب، منشی صاحب، پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں بر وی صاحب

در گیا ہو۔ تنہا مولوی کا لفظ بھی اس عہد میں علماء کے نام کے ساتھ نہیں ملتا۔ ایسے مرکب محض گزشتہ صدی کے مترادفات سے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننا پڑے گا اور بات بھی یہی ہے کیونکہ اگرچہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہے مگر قلمی نسخوں میں اس کی شکل بالکل مختلف ہے، جو حسب ذیل ہے ؎

دو جگ رہا خسرو کا نام　　خالق باری ہوئی تمام

ایک اور نسخے میں یوں ہے ؎

دو جگ بیچ رہیا خسرو نام　　خالق باری ہوئی تمام

ان شعروں میں اگرچہ خسرو کا تخلص موجود ہے لیکن اس سے پتا ثابت نہیں ہوتا کہ خسرو وہی مشہور امیر خسرو ہیں، خسرو اور لوگوں کا تخلص بھی ہو سکتا ہے۔"

[پنجاب میں اردو۔ حافظ محمود شیرانی
ص ۱۰۰ تا ۱۰۸ طبع دوم مجلس الادب لاہور]

میرا خیال ہے کہ خالق باری کو دوسرے خسرو کی تصنیف ثابت کرنے کی دھن میں حافظ محمود شیرانی نے مولانا چڑیا کوٹی کے نقل کئے ہوئے مقطع پر غور نہیں کیا۔ اس میں نہ تو "مولوی صاحب" کی مرکب ترکیب استعمال کی گئی ہے اور نہ "خسرو شاہ" کی۔ یہ الفاظ الگ الگ مترادفات ہیں جیسا کہ ساری خالق باری کے تقریباً ہر شعر میں پایا جاتا ہے۔ ایک عربی یا فارسی لفظ کے ساتھ اس کا ہندوستانی مترادف لکھ دیا جاتا تھا۔ اس شعر میں بھی مولوی کا لفظ (مولیٰ کے مفہوم میں) صاحب کا ہم معنی ہے، جیسے سرن (سنسکرت شرن) پناہ کے ہم معنی ہے، اسی طرح دوسرے مصرعے میں گدا بھکاری کا اور خسرو شاہ کا مترادف ہے۔ مولوی صاحب کو ایک مرکب لفظ مان لینے کے بعد سرن پناہ کے الفاظ کہاں جائیں گے اور اسی طرح خسرو شاہ کو ایک لفظ تسلیم کر لینے کے بعد گدا بھکاری کا کیا موقع باقی رہ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے۔ لیکن حافظ محمود شیرانی کی یہ دلیل یقیناً غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ شیرانی کا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ امیر خسرو کے زمانے تک شاہ کا لفظ فقراء کے نام کے ساتھ مستعمل نہیں تھا لیکن اس مقطع میں خسرو کے ساتھ شاہ کا لفظ ایک شاعرانہ لطف ضرور پیدا کرتا ہے، مولانا چڑیا کوٹی کے مطابق خاکساری اور انکسار کا نہ سہی، تفاخر اور تعلّی کا سہی۔



# ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم

(از عبدالماجد)

سید محمد حفیظ، آج سے کوئی چھہتر سال قبل قصبہ نونہرہ ضلع غازی پور کے ایک متوسط زمیندار سادات میں پیدا ہوئے۔ خاندانی اور پھر کچھ ذہنی اختلافات، خاندان والوں سے پیدا ہوئے۔ مگر چونکہ انھیں باہر نکلنا پڑا۔ تعلیم کہنا چاہیے کہ خود ہی سے ساری حاصل کی۔ میٹرک کیا۔ اور پھر اسکول میں ملازمت کر کے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۱۸ء تھا کہ وہ بی۔ اے کرنے کے لئے لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخل ہوئے اور میں سیتاپور ہائی اسکول سے میٹرک کر کے ایف۔ اے میں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے قائم ہونے میں ابھی بارہ سال کا وقفہ تھا۔

اصل نام کے بجائے وہ ایم۔ ایچ سید کے نام سے مشہور تھے۔ اور کالج کے ہوسٹل میں مقیم تھے۔ کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی کے بہت اچھے بولنے والوں میں تھے۔ میں اچھا بولنے والا کبھی نہ ہو سکا۔ جب کچھ کہنا سننا ہوتا تو مقالہ لکھ کر تیار کرتا اور وہ بھی اکثر کسی دوسرے کو سنانے کے لئے دے دیتا اور دوسرے بولنے والوں کو اپنے معلومات و مطالعہ سے دیا کرتا۔ مذہب سے ہم دونوں عمر کے اس حصہ میں بیزار تھے۔ اور یہی ہم دونوں میں نقطۂ اشتراک و اتصال قائم ہوا۔ فرق یہ تھا کہ ان کا رجحان تمامتر ہندوئیت اور ہندو علوم و فنون کی جانب رہا۔ اور وہ پہلے دیانند سرسوتی اور ان کی آریہ سماجی تحریک سے بہت زیادہ متاثر رہے۔ اور بعد کو مسز بسنٹ والے تصوف یا تھیاسوفی سے۔ اور اسی رنگ نے ان کا آخر تک ساتھ دیا۔ میرے اوپر اس کے برعکس تمامتر مغربی نشہ سوار تھا، میں فرنگی منطق و فلسفہ اور مادیت و الحاد میں مست تھا۔

حفیظ صاحب سن میں مجھ سے ۲-۳ سال بڑے تھے اور تعلیم میں بھی دو سال آگے تھے۔ لیکن ارتدادی اشتراک نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا۔ ہم دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور ایک مدت تک میں ان کی علمی قابلیت کا قائل و معتقد کیا معنی، بہت کچھ کہئے کہ اس سے مرعوب رہا۔ ان کی ہندو دوستی میرے بڑے کام آئی۔ وہ ہندو فلسفہ، تصوف پر نیز ہندو مذہب پر مجھے انگریزی کتابیں دکھاتے رہے۔ اور بعض یوپی کے ہندو فاضلوں (مثلاً بنارس کے فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس) سے انھوں نے مجھے ملایا بھی۔

(باقی صفحہ ۹ کالم ۲ پر)

اداریہ

# یونی ورسٹی میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

پٹنہ یونی ورسٹی نے انجمن ترقی اُردو بہار کے احتجاج پر بالآخر اتنی توجہ کی کہ ہندی کو سب کے لئے ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان بنانے کا سوال سنہ ۱۹۶۵ء تک ملتوی کر دیا۔ ہم پٹنہ یونیورسٹی کے اس اقدام کو سراہتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں بعض اہم باتوں کی طرف بھی ارباب اختیار کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے اب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مادری زبان یا علاقائی زبان میں صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی نہیں اعلیٰ تعلیم بھی ہونی چاہئے۔ اگر پٹنہ یونی ورسٹی ہندی کو ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان رکھنا چاہتی ہے تو اصولی طور پر ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ مگر یونی ورسٹی کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ ہندی کے علاوہ اس علاقے کی دوسری اہم زبانوں کی بھی ہمت افزائی کرے اور انھیں بھی ذریعۂ تعلیم یا ذریعۂ امتحان بنائے اور اگر کسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا اس کے لئے دشوار ہو تو کم سے کم امتحان کا ذریعہ بنانے میں پس و پیش نہ کرے۔ اگر پٹنہ یونیورسٹی ہندی کے علاوہ اُردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں امتحان کے سوالوں کے جواب دینے کی اجازت اب تک دیتی رہی ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اصول وہ تسلیم کر چکی ہے اور اس پر عمل بھی کرتی رہی ہے۔ اس اصول کو بدلنے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل انتظامی، دوسرے جذباتی۔ ہمارے خیال میں انتظامی دشواریاں نہ ہونے کے برابر ہیں، ہاں کچھ لوگ جذباتی ہم آہنگی کے لئے ایک زبان کی لاٹھی سے سب کو ہانکنا چاہتے ہیں۔ انھیں ممکن ہے یہ پسند نہ ہو کہ یونی ورسٹی میں کچھ لوگ ہندی کے علاوہ کسی اور زبان میں امتحان دیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قابلیت کا صرف یہی ایک معیار ہے کہ امیدوار اپنی صلاحیت کا اظہار ہندی زبان میں کرے۔ حالانکہ انگریزی یا اُردو یا بنگالی میں بھی قابلیت کا اظہار ہو سکتا ہے اور ملک کو صرف اس پر اصرار ہونا چاہئے۔ اس طرح یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ صرف ہندی کو ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان رکھنے کی کوشش تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہے، دوسرے مقاصد کے لئے ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جذباتی ہم آہنگی کے لئے ایک زبان ہونا ضروری نہیں۔ ہاں ایک قومیت کے جذبے سے سرشار ہونا ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ سرشاری اس وقت ممکن ہے جب مختلف لسانی گروہ اپنے اپنے راستے سے منزلِ مقصود تک پہنچیں اور سب کے لئے ایک زبان پر اصرار کرنا، اس مقصد میں خلل ڈالتا ہے جس کے پورا کرنے کی نیت سے ہے۔

اب ایک دوسرے مسئلے کو بھی دیکھنا چاہئے۔ پٹنہ یونیورسٹی گو زیادہ بہار کی علمی ضروریات کو پورا کرے گی، مگر وہ پورے ملک کی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ کیا پٹنے کے گریجویٹ صرف بہار اور اُن ریاستوں کے لئے کام کریں گے جو ہندی کی ریاستیں ہیں؟ یا پورے ملک کے لئے مفید ہوں گے۔ اگر یہ صرف ہندی کے علاقوں کے لئے نہیں، سارے ملک کے لئے ہوں گے تو ہندی کے علاوہ اُردو یا بنگالی میں خاص مہارت ملک کے لئے مفید ہی ہوگی، مُضر ہرگز نہ ہوگی جبکہ وہ ہندی میں بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہی ہوں گے کیونکہ ہندی انھوں نے لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھی ہوگی۔ صرف ہندی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے یا ذریعۂ امتحان بنانے میں ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ ضرور ہے۔ اس لئے اوّل تو اس میں جلدی نہیں کرنی چاہئے اور ہندی کو علمی معیار سے اور بلند کرنا چاہئے، دوسرے اس کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی اہم زبانوں کو بھی ذریعۂ تعلیم یا ذریعۂ امتحان رکھنا چاہئے۔

ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ کیا انگریزی زبان کو ہٹا کر اور ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ہم علم کی اور قوم کی واقعی خدمت کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ اب ثانوی منزل پر انگریزی کی قابلیت کا معیار بہت کم ہو گیا ہے اور ہندی کا معیار پہلے سے بہت بہتر ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم یونی ورسٹی معیار کے مسئلے کو یکسر نظر انداز کر کے ہندی اور صرف ہندی پر اصرار کریں۔ ایسے معاملات میں جلدبازی مُضر ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ سیاسی نہیں خالص علمی اور تعلیمی ہے۔ اسے سیاست دانوں کا کھلونا نہیں بنانا چاہئے، صرف اساتذہ اور طلبۂ نصاب اور درسی کتابوں کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اُتر پردیش میں ایک زمانے میں انگریزی چھٹے درجے سے اختیاری مضمون کی حیثیت سے تھی اب اسے تیسرے درجے سے رائج کیا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انگریزی کا اچھا معیار تعلیمی اور قومی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ صرف ہندی پر اصرار کرنے سے یہ نقطۂ نظر بھی مجروح ہوتا ہے۔

پٹنہ یونی ورسٹی کو چاہئے کہ وہ صرف تین سال تک سب طلبہ کے لئے ہندی میں جوابات دینے کا سوال ملتوی کرنے کے بجائے سارے پہلوؤں پر پھر سے غور کرے اور جذبات سے بلند ہو کر یا وقار کی بات بیچ میں لائے بغیر غور کرے پھر شاید وہ اس نتیجے پر پہنچے گی کہ ہندی کے علاوہ اس علاقے کی دوسری اہم زبانوں میں جواب دینے کی اجازت اچھی بات ہے اور یہ سہولت مستقل طور پر دینی چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ اُردو جاننے والے ہندی نہیں پڑھنا چاہتے یا ہندی میں کمزور ہوتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ ان کی قابلیت اُردو میں زیادہ اچھی طرح ظاہر ہوگی اور ان کی اس قابلیت سے ملک کو اور قوم کو فائدہ پہنچے گا۔ ترقی کا کبھی ایک راستہ نہیں ہوتا، بہت سے راستے ہوتے ہیں اور ایک اچھے تعلیمی نظام میں سب کی گنجائش ہونی چاہئے۔

# انجمن ترقی اردو بہار نے حکومت کے سامنے اپنے مطالبات واضح کر دئے

## بعض مطالبات کی فوری اور عملی منظوری کا پرزور مطالبہ

پٹنہ ۱۴ جنوری ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کونسل کی دوسری اہم نشست گیارہ بجے دن میں زیر صدارت جناب محمد ایوب ایڈوکیٹ صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو بدولت صدر موصوف منعقد ہوئی۔ جناب محمد ایوب نے گذشتہ اجلاس کی تجاویز کی روشنی میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کوششوں، اور اس سلسلے میں پیدا شدہ صورت حال سے اجتماع کو آگاہ کیا۔ ہر ضلع اور ہر حلقہ سے کافی تعداد میں نمائندوں نے شرکت کی حسب ذیل تجاویز متفقہ طور پر منظور ہوئیں ۔

**تجویز (۱)** بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کانسل کی اس غیر معمولی نشست کی رائے میں پٹنہ یونیورسٹی کی اکیڈیمک کانسل کا یہ فیصلہ جس کی رو سے مادری زبان میں غیر لسانی پرچوں کا جواب سنہ ۱۹۹۳ء تک دینے کی سہولت برقرار رکھی گئی ہے ۔ لسانی اقلیتوں کو محض ایک عارضی رعایت دینے کے مرادف ہے اور ان کے مستقبل کی زندگی اور کیریر کے اہم مسئلہ کا حل نہیں ہے ۔ مادری زبان میں یونیورسٹی کے تمام مدارج کے امتحانات میں جواب لکھنے کا حق بنیادی بھی ہے اور روایتی بھی اور انہیں اس حق سے محروم کرنا سخت ناانصافی ہوگی اور ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ ہوگا جو آئین کے منافی بھی ہے۔ کانسل کا یہ مطالبہ ہے کہ ان کا یہ حق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برقرار رہنا چاہئے۔

**تجویز (۲)** کانسل کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ بہار کی اردو لسانی اقلیتی آبادی کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ اردو کو بہار کی ایک علاقائی زبان تسلیم کیا جائے اور ان مقاصد کے لئے جن کا ذکر مختصر ناموں میں کیا جاتا رہا ہے جو صدر جمہوریہ ہند اور حکومت بہار کی خدمت میں وقتاً فوقتاً پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اس کے استعمال کی سہولت جاری کر دی جائے کانسل مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت بہار صدر جمہوریہ کے پاس اس کی سفارش کرے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کی رو سے اردو کو بہار کی علاقائی زبان قرار دیں اور حکومت بہار ایسے ذرائع اختیار کرے جن کی رو سے بہار آفیشیل لنگویجز ایکٹ میں مناسب ترمیمیں لاکر دفعہ ۳۴۵ کی رو سے اردو کو بھی مخصوص کاموں کے لئے سرکاری زبان تسلیم کیا جائے ۔

**تجویز (۳)** اس کانسل کی یہ بھی رائے ہے کہ فوری طور پر بہار کی اردو آبادی کے ذہن و قلب سے غایت مایوسی بددلی اور بیزاری کا جذبہ دور کرنے کی غرض سے جو پچھلے چند برسوں میں حکومت کے رویہ سے پیدا ہو چکی ہے۔ مندرجہ ذیل مطالبات کو تسلیم کر کے اس سلسلے میں فوری احکامات بلا تاخیر صادر کئے جائیں ۔

(الف) ریاستی سطح پر ایک لسانی کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو انجمن کے مندرجہ بالا متذکرہ مختصر ناموں میں کئے گئے مطالبات پر غور کر کے اپنی سفارشات سال بھر کے اندر حکومت کو پیش کرے ۔ کانسل مذکور کا مطالبہ ہے کہ کمیٹی مذکور میں انجمن کو خاطر خواہ نمائندگی دی جائے ۔

(ب) بہار کی اردو لسانی آبادی کو بہار کی عدالتوں اور دفاتر میں عرضیاں، بیان تحریری درخواستیں وغیرہ گذارنے کی سابقہ سہولتیں برقرار رکھنے کے احکامات جلد از جلد صادر کر دئے جائیں ۔

(ج) جس طرح پبلک سروس کمیشن میں امتحان دینے والے امیدواروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ لازمی ہندی کے پرچہ میں صرف پاس کرنا ضروری ہے لیکن ان کے نمبر امتحان کے مجموعی نمبروں میں نہیں جوڑے جاتے ہیں اسی طرح حکومت کے ذریعہ لئے گئے تمام دیگر امتحانات میں جو مختلف اسامیوں کی بحالی کے لئے لئے جاتے ہیں ان میں بھی یہ سہولت برقرار رکھنے کے احکامات فوراً جاری کر دئے جائیں ۔

(د) یہ بھی ضروری ہے کہ پبلک سروس کمیشن اور دیگر متذکرہ بالا امتحانات میں اردو داں امیدواروں کے لئے ہندی کے جو پرچے ہوں ان کا معیار بھی ان پرچوں کے مقابلہ میں کم تر ہو جو ہندی داں امیدواروں کے لئے چنے جاتے ہیں جیسا کہ یونیورسٹی اور سکنڈری امتحانوں میں رائج ہے کانسل مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت فوراً ایسے احکامات جاری کرے جس کی رو سے اردو داں امیدواروں کے لئے ہندی لازمی پرچہ کا معیار مقابلتاً کم کر دیا جائے ۔

(س) کانسل مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت اپنی تمام تعلیمی کمیٹیوں میں انجمن کو بھی مناسب نمائندگی دے تاکہ بہار کی اردو آبادی کے حقوق کا مناسب طور پر نگرانی اور تحفظ ہو سکے۔ مثال کے طور پر ٹیکسٹ بک کمیٹی بی ڈی سی کمیٹی ای آئی بی اسکیم پلاننگ کمیٹیاں وغیرہ وغیرہ

**تجویز (۴)** ۱۰ جنوری سنہ ۹۳ کو وزیر اعلیٰ سے انجمن کے وفد سے ملنے کے سلسلے میں یہ جلسہ صدر انجمن کو مجاز کرتا ہے کہ وہ ریاست کے ہر حصہ کے نمائندہ اردو دوستوں پر مشتمل وفد کی ترتیب کر کے وزیر اعلیٰ سے ملیں ۔

**تجویز (۵)** بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کانسل کا یہ جلسہ پٹنہ میونسپل کارپوریشن کے اس رویہ کے خلاف انتہائی افسوس کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کارپوریشن نے اردو تعلیم سے سخت بے توجہی برتی ہے اور اردو لسانی اقلیتوں کے لئے ابتدائی تعلیم کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ابتدائی تعلیم کی پوری ذمہ داری کارپوریشن نے اپنے ذمے لیا ہے درزی ٹولہ اردو پرائمری اسکول اور نرکٹ گھاٹ پرائمری اسکول اور مہاراج گنج کو اردو مڈل اسکول کا درجہ دینے کے لئے چند برسوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے اور کارپوریشن نے تحقیقات کے بعد دونوں جگہوں میں دو مڈل اسکول قائم کرنے کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے لیکن ابھی تک اسے عملی شکل دینے کے لئے اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔

یہ جلسہ کارپوریشن کے ذمہ داروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً مڈل اسکول کے قیام کے لئے عملی اقدام کریں ۔ یہ جلسہ کارپوریشن کے اردو کونسلروں کو بھی توجہ دلاتا ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ دیں اور اس مطالبہ کو فوراً کامیاب بنائیں ۔

آفس سکریٹری،
بہار ریاستی انجمن ترقی اردو

وحید مرزا

## ہندوستان

دیویوں دیوتاؤں کی یہ سرزمیں
یا بروئے زمیں جیسے خلدِ بریں
ہاں مہابیر، گوتم کا پیارا وطن
جس کے سینہ میں طوفانِ گنگ و جمن
جس کی مٹی ہے سونا تو امرت ہے جل
جس کی زلفوں میں گنگا کی لہروں کے بل
جس کے ماتھے پہ صبحِ بنارس کا نور
یا حسینہ کوئی جیسے مستی میں چور
جس کے گالوں پہ شامِ اودھ کا نکھار
جس کے دامن میں کشمیر کے لالہ زار
جس کے ہونٹوں پہ اقبال کی شاعری
جس کے سانسوں میں ٹیگور کے گیت ہیں
جو ابھی سوزِ پنہاں سے معمور ہے
یا کسی دھند میں جیسے اک نور ہے
مادرِ ہند کی بیٹیوں کے لئے
ہاتھ میں ہتھکڑی پاؤں میں بیڑیاں
شاہراہوں پہ گھستی ہوئی ایڑیاں
اور ہونٹوں پہ بس موت کی ہچکیاں
کتنی ہی گل بدن سرو قد سیم تن
کتنی ہی رشکِ مہتاب غنچہ دہن
پھول جیسے یہاں کتنے گلفام و دہن
بے سہارا ہیں وہ رونقِ انجمن
رانی جھانسی کی آتشِ نفس زندگی
اور سیتا کے دامن کی پاکیزگی
آج بھی جیسے اک جنسِ بازار ہے
باعثِ شرم ہے باعثِ عار ہے
اک طرف کالے بازار کی گود میں
دھان و گندم کے دانوں سے معمور ہیں
اک طرف بے سہارا ہیں اہلِ وطن
جیسے رستا ہوا ایک ناسور ہو
بھیک کی روٹیوں کو ترستے ہوئے
کتنے پیر و جواں بے سہارا ہیں
کوڑے کچرے پہ پڑتے ہوئے استخواں
مردہ کھالوں کے بازار میں دام ہیں
آج تاج اور اجنتا کے اس دیس میں
زندگی کی مگر کوئی قیمت نہیں
سنگ اور خشت کا بھی یہاں مول ہے
ایک انسان کی کوئی قیمت نہیں
یہ صدا تشنہ ہے اے میرے اہلِ وطن
تابشِ عزم بھی انجمن جن سے ہے
جو اندھیروں میں بھی نور بنتے رہے
رشکِ گلزار اپنا وطن جن سے ہے
جن کے سینوں میں لاوا ابلتا ہوا
جن کے سوئے ہوئے دست و بازو ہیں
جن کے دل میں امنگوں کی ہیں مشعلیں
جن کی آنکھوں میں شعلے ہیں آنسو نہیں
اے مرے بھائیو ساتھیو دوستو
آؤ صدیوں کے خوابِ گراں سے اٹھو
اٹھ کے پھر موت کو زندگی بخش دو
ان اندھیروں کو تابندگی بخش دو

ایم کوثر شیادوی ماہی

## جاڑے کا چاند

چاند
اے جاڑے کے چاند!
مولسری کے پیچھے تنہا رات بھر
دیکھتا رہتا ہے کس کی راہ تو!؟
کپکپاتا بھی نہیں
تھرتھراتا بھی نہیں
یہ ترا اجلا بدن! ——————
تیری دھرتی پر یقیناً کوئی شعلہ ہے ضرور
جو تجھے گرما گیا
ساری دنیا کو نظر آتا نہیں
ورنہ تو یخ بستہ ہو جاتا ضرور! ——

چاند
اے جاڑے کے چاند!
دیکھ مجھ کو شل ہوا جاتا ہوں میں ——!

طاہر بریلوی

## غزل

جادۂ عشق کو ہموار کروں یا نہ کروں
دہر کو گلشنِ بے خار کروں یا نہ کروں
چارۂ حالِ دلِ زار کروں یا نہ کروں
آرزوئے ستمِ یار کروں یا نہ کروں
چشمِ خوابیدہ کو گلبار کروں یا نہ کروں
دامنِ زیست کو گلزار کروں یا نہ کروں
خود فروشی کا ہے اک شاعرِ خوددار پہ
فاش یہ رازِ دروں و دار کروں یا نہ کروں
حسنِ معصوم پہ گستاخ نگاہی ہو
فتنے خوابیدہ ہیں بیدار کروں یا نہ کروں
چشمِ پرنم میں لئے عکسِ تخیل طاہر
رخ سوئے وادیٔ کہسار کروں یا نہ کروں

# مراسلات

## غلطیہائے مضامین

"ہماری زبان" ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۱ء میں میرا ایک مضمون "اکبر الٰہ آبادی کی دو کتابیں" شائع ہوا ہے جس میں میں نے مرزا محمد عباس (سول سروس اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی) کے نام کے ساتھ "بیگ" کا اضافہ کرکے انھیں مرزا غالب کا حقیقی بھانجہ لکھا ہے اور اسی طرح مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کو مولانا عبدالماجد دریابادی کا ماموں" تحریر کیا ہے۔ اور یہ تسامح ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا محمد عباس بیگ تعلقہ دار بڑاگاؤں ضلع سیتاپور (مرزا غالب کے حقیقی بھانجے) چونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہردوئی اور سیتاپور کے "اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر" مقرر ہوئے تھے اس لئے بھی مجھے یہ سہو ہوا۔ برادر محترم حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا ممنون ہوں کہ موصوف نے سب سے پہلے میری ان ناخوشگوار غلطیوں کی طرف توجہ فرماکر مجھے مطلع کیا۔ مولانا کا یہ مراسلہ من وعن پیش کیا جارہا ہے جس سے میرے مضمون کے ان حصوں کا جھول دور ہوجائے گا جو ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے اس مضمون میں پیدا ہوگیا ہے۔

(نادم سیتاپوری)

برادرم سلمہ اللہ۔ السلام علیکم

۱۔ یہ مولوی محمد کریم پنشنر ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کوئی اور صاحب تھے۔ سرسید کے دور میں ان کا ذکر اور بھی ملتا ہے۔ میرے ماموں صاحب نہ تھے۔ وہ تحصیلداری ہی سے ریٹائر ہوگئے تھے۔ ان کا قیام زیادہ تر ضلع الٰہ آباد ہی میں رہا۔ اور یہیں حضرت اکبر سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے۔ یہ سرسید کے زمانے میں بہت جونیر رہے ہوں گے ——— یہ "ہم نامی" کی بلا بھی عجیب ہوتی ہے۔ اچھے اچھے محقق اس کے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔

۲۔ مرزا محمد عباس اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی بھی عباس بیگ ہمشیرزادہ غالب نہ تھے خالص لکھنوی تھے۔ آغائی صاحب مشہور ناظم اودھ کے صاحبزادے۔ میرے والد صاحب مرحوم سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ اپنے بچپن میں ان کے خطوط میں نے دیکھے تھے۔ عزیز لکھنوی ابتداً انھیں کے دربار سے متوسل رہے۔

۳۔ اکبر کی نثر نگاری کے نمونے "اودھ پنچ" کی ابتدائی جلدوں میں مل جائیں گے۔ ایک نمونہ غالباً ۱۹۰۱ء کا چھپا ہوا مجھے اب تک یاد ہے (پڑھا نہیں گیا) خدا دیو ناگری پر لطیف طنز تھا۔ خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی رکی ہوئی ہے کہ انھوں نے اونٹ کی سواری چھوڑ دی ہے۔ اب اگر انھیں اپنی ترقی منظور ہے تو لازم ہے کہ اونٹ کی سواری اپنے اوپر لازم کرلیں۔ اسکول اور کالج میں اونٹ۔ ہائی کورٹ کے احاطے میں اونٹ وغیرہ۔

سرسید سے اکبر صاحب کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ اکبر ان کی نیک نیتی و اخلاص کے ہمیشہ قائل رہے صرف ان کے اجتہادات پر معترض رہے۔ والسلام

دعاگو
عبدالماجد

## اکبر الٰہ آبادی کی دو غیر معروف کتابیں

۲۲ر دسمبر ۱۹۶۱ء کے "ہماری زبان" میں جناب نادم سیتاپوری نے عنوان بالا کے تحت جو مضمون سپرد قلم فرمایا ہے میری نظر سے گذرا۔ موصوف کا یہ فرمانا کہ غالباً خیر چاہ اسلام (Future of Islam) کے ترجمے کا دوسرا ایڈیشن پھر شائع نہیں ہوا صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چند سال ہوئے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے شائع کیا تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں دوسرا ایڈیشن ابھی تک دستیاب ہوتا ہے۔ اس دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ میرے عزیز دوست شیخ عبدالقدوس صاحب سب انسپکٹر پولیس ضلع چھپرہ کے پاس موجود ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی شگفتہ نثر کے نمونے اودھ پنچ کی پرانی جلدوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اودھ پنچ کی پرانی جلدیں جناب راجہ صاحب محمود آباد بالقابہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور ان بکھرے نثر پاروں کو علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر صاحب نے میگزین کے اکبر الٰہ آبادی نمبر میں شائع کردیا تھا۔ عرصہ ہوا رسالہ مخزن لاہور میں بھی حضرت اکبر الٰہ آبادی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ تھا۔ اس مضمون کی سرخی تھی "مذہب کی تعریف"

(محمد بشیر الحق دسنوی بہاری)

## مولانا عبدالعلیم آسی

"ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں جناب محمد بشیر الحق صاحب کا خط نظر سے گزرا۔ ان کا شک بالکل صحیح ہے۔ حضرت مولانا آسیؒ کا اسم گرامی "عبدالعلیم" ہی تھا۔ ان کی پیدائش سکندرپور میں ہوئی لیکن زندگی کا بیشتر حصہ شہر غازی پور کے مشہور محلہ نورالدین پورہ کی ایک خانقاہ میں یاد الٰہی میں گزارا وہ اپنے آپ کو غازی پور ہی سے منسوب کرتے تھے۔ حضرت آسیؒ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کے معتقدین کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ غازی پور ہی میں ان کا وصال ہوا اور وہیں روضہ تعمیر ہوا۔ اب بھی ہر سال ان کا عرس ہوا کرتا ہے۔

حضرت آسیؒ کبھی مدراس تشریف نہیں لے گئے اور نہ انھوں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ مدراسی لکھا۔ آسی مدراسی صاحب کے بارے میں بشیر الحق صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے

ظہیر غازی پوری (بی۔ اے) گیا۔ (بہار)

# انجمن کا خبرنامہ

## انجمن ترقی اردو حیدرآباد

(رپورٹ جو آندھرا پردیش اردو کانفرنس میں پڑھی گئی)

دسمبر ۱۹۴۹ء میں جب انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ حیدرآباد کا دوبارہ احیاء عمل میں آیا تو یہاں اردو بولنے والوں پر مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس طبقۂ آبادی کے قوائے عمل پورے طور پر مفلوج ہو چکے ہیں۔ انجمن کے ساتھ تعاون کرنا تو ایک طرف، لوگ اردو کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ چار سال تک اسی ہمت شکن ماحول میں انجمن جس طرح ممکن ہو سکا کام کرتی رہی۔

بالآخر ہمت کرکے ۱۹۵۳ء میں ایک حیدرآباد ریاستی اردو کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ خدا کی قدرت کہ یہ اعلان اردو کے حق میں انتہائی مفید ثابت ہوا اور بغیر کسی خاص تشہیر و پروپگنڈہ کے لوگ بڑی تعداد میں مجلس استقبالیہ کے رکن بننے لگے اور اردو کے مشہور مرد مجاہد پنڈت کشن پرشاد کول لکھنوی کی صدارت میں یہ کانفرنس بڑی کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی اور اس کا بڑا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اردو بولنے والوں میں پھر حرکت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر انجمن ہی کے چند کارکن آگے بڑھے اور اردو ہال کے نام سے ایک ثقافتی مرکز کے قیام کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے تعمیر کے لئے ایک موزوں قطعۂ زمین اور مبلغ پندرہ ہزار روپے یکمشت حاصل ہوگئے جس کی وجہ سے تحریک میں ایک طرح کی جان پڑ گئی اور حیدرآباد کی پبلک نے چند ہی ہفتوں کے اندر اتنی رقم اکٹھا کردی کہ جنوری ۱۹۵۵ء میں عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال کے آخری مہینے میں وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو کے ہاتھ سے اس کے ایک حصہ کا افتتاح ہوا۔ اردو ہال کی تعمیر نے اردو بولنے والوں کی عملی قوتوں کو دوبارہ متحرک کرنے میں ایک طرح سے تریاق کا کام کیا اور اردو کے مستقبل کے بارے میں ہر طرف جو تاریکی چھائی ہوئی تھی اس میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی جس کی روشنی اس وقت سے برابر پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ حیدرآباد کے اردو پریمیوں پر اس نفسیاتی ٹانک کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ انھوں نے ہمت کرکے دوسرے ہی سال ایک اردو کالج بھی قائم کردیا جسے عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے M.A. اور B.Ed. کے امتحانات کے لئے تسلیم کرلیا۔ اس کے کچھ ہی بعد آندھرا پردیش کی نئی ریاست وجود میں آئی اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بھارت کی یہ پہلی ریاست ہے جس نے اردو کو دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ریاستی حکومت کی اس معلنہ پالیسی پر عمل کرنے میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں، انھیں دور کرنے کے لئے ہمت و ایثار سے کام لے کر ممکنہ جدوجہد کریں۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ انجمن کی گزشتہ گیارہ سالہ کارگزاری کی تفصیلی رپورٹ پیش کی جائے البتہ جس طریقے پر انجمن اس علاقے میں اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہی ہے اس کا ایک مختصر سا خاکہ اس کانفرنس کی اطلاع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سیاسی تبدیلی کے بعد یہاں کے اکثر چھوٹے اور بعض بڑے کتب خانے بھی آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے، معاشی تنگی سے مجبور ہو کر لوگوں نے اپنی یا اپنے بزرگوں کی جمع کی ہوئی کتابیں بیچنی شروع کیں یہاں تک کہ ان کا بڑا حصہ پاکستان منتقل ہو گیا اور کچھ ادھر ادھر چلا گیا۔ اس کے علاوہ جو لوگ جلد بازی میں یہاں سے نکل پڑے وہ بھی اپنے پیچھے کتابوں کے چھوٹے بڑے ذخیرے چھوڑ گئے یہ دیکھ کر انجمن نے اردو ہال کے تحت ایک نئے مرکزی کتب خانے کی بنا ڈالی اور پبلک سے اپیل کی کہ جو کتابیں وہ خود رکھ نہیں سکتے یا رکھنا نہیں چاہتے وہ اس کتب خانہ کے حوالے کردیں تاکہ کتابیں منتشر اور ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ افسوس ہے کہ ہماری اس اپیل پر جیسی چاہئے ویسی توجہ نہیں ہوئی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا اور اس طرح کتب خانے کو اب تک تقریباً ڈھائی ہزار کتابیں مل گئیں۔ انجمن اور اردو ہال ٹرسٹ دونوں کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ اس کتب خانہ کو جدید و قدیم مطبوعہ کتابوں کا ایک بڑا مرکز بنایا جائے۔

(۲) سابق میں شہر حیدرآباد کے اکثر محلوں میں اردو کے چھوٹے چھوٹے دارالمطالعے دکھائی دیتے تھے جو سیاسی تبدیلی کے بعد یہ بھی یکایک ناپید ہوگئے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی دو چار کام کرنے والے مل جائیں، انجمن انھیں ترغیب دیتی ہے کہ وہ اپنے محلے میں ایک چھوٹا سا دارالمطالعہ قائم کرلیں۔ جب مقامی کوشش سے دارالمطالعہ قائم ہو جاتا ہے تو انجمن اخباروں اور رسائل کی شکل میں ان کی تھوڑی بہت مدد کرتی ہے۔

## فیض کا قطعہ

(جو آندھرا پردیش اردو کانفرنس کے لئے بھیجا گیا)

میری طرف سے اردو کانفرنس کو تہنیت پہنچا دیجئے۔ مشاعرے کے لئے نظم ملفوف ہے۔ مخدوم ہوں تو کہیے سنا دیں۔

مخلص فیض

### قطعہ

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

ہے کوئی بیس دار المطالعے اس وقت انجمن سے امداد پاتے ہیں۔

(۳) حیدرآباد کے بعض بڑے کتب خانوں میں اردو اور بعض دوسری زبانوں کے بھی مخطوطات بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ان کی کوئی فہرستیں نہیں تھیں اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ ان مخطوطات میں ہے کیا؟ انجمن نے ایک صاحب ذوق ادیب کی خدمات حاصل کر کے ان مخطوطات کی ترتیب و توضیح کا کام شروع کیا۔ چنانچہ اب تک دو بہت بڑے کتب خانوں اور ایک نسبتاً چھوٹے کتب خانے کی حد تک یہ کام جہاں تک اردو زبان کے مخطوطات کا تعلق ہے ختم ہو چکا ہے۔ سالار جنگ لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فہرست جو تقریباً ایک ہزار صفحوں پر مشتمل ہے شائع بھی ہو چکی ہے جس کے لئے ہم سب کو اسٹیٹ کمیٹی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ سنٹرل اسٹیٹ لائبریری (سابق کتب خانہ آصفیہ) کی توضیحی فہرست جو سب سے پہلے تیار ہو چکی تھی بلا اشاعت پڑی ہوئی تھی۔ لیکن مسرت ہے کہ حال میں مرکزی حکومت کی امداد سے اب اس کے شائع ہونے کی بھی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ مہینے کے اندر وہ بھی شائع ہو جائے گی۔ تیسری توضیحی فہرست جو انجمن کی کوشش سے مرتب ہوئی ہے وہ حیدرآباد اسٹیٹ میوزیم کی لائبریری سے متعلق ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے ابھی تک کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

(۴) انجمن کے مقاصد میں ان پڑھوں اور اردو نہ جاننے والوں کی اردو تعلیم کا انتظام کرنا بھی شامل ہے۔ آغاز کار ہی سے انجمن نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس شعبے میں ہمیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑی کوشش اور جد و جہد کے بعد تعلیم بالغان کے مرکز قائم ہوتے ہیں لیکن جلد ہی وہ ٹوٹ بھی جاتے ہیں تجربے سے اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ایسے اشخاص کی کمی جو بلا معاوضہ یا معمولی سے معاوضہ پر گھنٹہ دو گھنٹے وقت دینے کے لئے تیار ہوں دوسرے خود ان پڑھوں کی بے حسی اور بے پروائی۔



(۵) انجمن کا ایک اہم مقصد اردو زبان میں سہل اور مفید کتابوں کی تصنیف و ترجمے کا انتظام کرنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑے اہتمام اور خرچ کا طالب اور ایک ریاستی شاخ کے حوصلے سے باہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس شعبہ میں بھی انجمن اپنا کوئی بڑا کارنامہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پھر بھی ہم نے کچھ نہ کچھ خانہ پری کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ گذشتہ پانچ چھ سال میں حسب ذیل کتابیں انجمن نے اپنے خرچ سے شائع کی ہیں۔

(۱) گوتم بدھ (طویل نظم) از فضل الرحمن

(۲) بچوں کی کتابیں:۔ بچوں کے گیت از لطیف النساء بیگم

مزے دار کہانیاں از حفیظ الدین

چند بڑے آدمی از مقبول محمد سیوہاروی

ہونہار (ڈراما) از شجاع احمد

(۳) سقراط (تاریخی ڈراما) از فضل الرحمن

(۴) چنگیز

(۵) ابتدائی انسانی سماجیات از ناظر شجاعت

(۶) روداد کل ہند اردو کانفرنس ۱۹۵۴ء از حسینی شاہد

(۷) چراغ منزل از شاہد صدیقی

(۸) تلگو ادب کی تاریخ از ڈاکٹر بیجے لکشمی و زینت ساجدہ

(۹) تلگو اردو لغت از کے۔ گوپال کرشنا راؤ

(۱۰) پاس گریبان از سلیمان اریب

(۶) ہماری جد و جہد کا ایک اور اہم شعبہ اردو مجلس ہے جسے انجمن ہی کے کارکن بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ یہ انجمن کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے اس کے تحت ہر مہینے کے آخری اتوار کو اردو شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے جمع ہوتے ہیں، کسی ادبی یا ثقافتی عنوان پر مقالہ پڑھا جاتا ہے اور پھر کچھ دیر کے لئے محفل شعر و سخن منعقد ہوتی ہے حاضرین کی تعداد اور نوعیت کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہ اجتماع پبلک میں بہت مقبول ہیں۔ اردو مجلس کی طرف سے ہر سال کسی بڑے ادیب یا شاعر کے اعزاز میں بڑے پیمانے پر تقریب منائی جاتی ہے۔ "اردو مجلس" نامی ایک سہ ماہی رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے جو ہندو پاکستان کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

(۷) انجمن کا یہ ایقان ہے کہ جب تک کسی زبان میں مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ ہو، وہ زبان ٹھٹھری ہوئی سی رہتی ہے اور اس کا نشو و نما مکمل نہیں ہوتا، اسی بنا پر انجمن نے بڑی کوشش اور تمناؤں سے ایک اردو کالج کی بنا ڈالی اور انتہائی ہمت شکن حالات کے باوجود گذشتہ پانچ سال سے اسے چلائے جا رہی ہے۔ سر دست اس کالج میں صرف اردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی یا تلگو یا انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے اور طالب علموں کو عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحانات DP.O.L اور B.O.L کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن آئندہ جب کبھی عثمانیہ یونیورسٹی کے موجودہ ذریعہ تعلیم انگریزی کو بدلا جائے گا تو ہمیں یقین ہے کہ

میں بھی تلگو کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی ذریعہ تعلیم رکھا جائے گا اور اس وقت ہمارا یہ اُردو کالج صرف B.A. اور B.Sc. تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس میں اُردو کے ذریعہ دوسرے علوم و فنون کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جا سکے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہی امید اور آرزو ہے جو اس وقت ہماری ڈھارس بندھائے ہوئے ہے اور جس کے سہارے ہم موجودہ نامساعد حالات کا برابر مقابلہ کئے جا رہے ہیں۔

(۸) اُردو ہال کی تحریک و تعمیر کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرنا اور پھر اس کی تکمیل کے لئے موزوں تدبیریں اختیار کرنا' یہ کام بھی زیادہ تر انجمن ترقی اُردو ہی کے کارکنوں نے انجام دیا ہے۔ پلان کے مطابق ابھی اُردو ہال کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہم کوشاں ہیں کہ آہستہ آہستہ یہ کام بھی تکمیل پا جائے۔

(۹) نومبر ۱۹۶۰ء سے فروری ۱۹۶۱ء تک انجمن نے مردم شماری کے تعلق سے جہاں تک اس کا مالیہ اجازت دے سکتا تھا' ضروری تدبیریں اختیار کیں۔ جہاں انجمن کی مقامی شاخیں تھیں وہاں ان کے کارکنوں کے ذریعے سے اور جہاں شاخیں نہیں تھیں وہاں دوسرے ہمدرد اداروں اور افراد کے تعاون سے 'اُردو' تلگو اور انگریزی زبانوں میں کئی لاکھ پرچے تقسیم کئے گئے' تاکہ اُردو بولنے والے مردم شماری کے وقت اپنی زبان صحیح طور پر درج کرائیں۔

انجمن کی جد و جہد کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک حکومت کے تعلق سے اور دوسرے خود اُردو بولنے والوں کے تعلق سے۔ اُردو والوں کی ضروریات سے حکومت کو باخبر رکھنا، ان کی مشکلات اور شکایات حکومت تک پہنچانا اور ان کے دفعیہ کی کوشش کرتے رہنا یہ ذمہ داری انجمن نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ گو ہماری ہر کوشش کامیاب نہیں ہوتی تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں آندھرا پردیش کی حکومت اس معاملے میں زیادہ ہمدرد اور انصاف پسند واقع ہوئی ہے اور اگر ہم مناسب طریقے پر استقلال کے ساتھ اپنی جد و جہد میں لگے رہیں اور خود بھی تھوڑے بہت ایثار سے کام لیں تو یقین ہے کہ آہستہ آہستہ ہماری تمام واجبی شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔

لیکن حکومت سے کہیں زیادہ ذمہ داری خود اُردو بولنے والوں کی ہے اس لئے انجمن کو خود اپنوں سے شکایت کرنے کا بھی ناخوشگوار فریضہ وقتاً فوقتاً انجام دینا پڑتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اصحاب خود کسی قسم کی تکلیف اُٹھائے بغیر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام قومی و اجتماعی کام سدھر جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات قانون قدرت کے مطابق نہیں ہے۔ مکافاتِ عمل کا قانون کسی کی طرف داری نہیں کرتا۔ اس لئے ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی اجتماعی حالت کو بہتر بنانے کی ذمہ داری بنیادی طور پر خود ہم پر ہے۔

# بقیہ

## ڈاکٹر حفیظ سیّد مرحوم

بی۔ اے اور ایل ٹی کرنے کے بعد اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ اور لکھنؤ، کانپور اور الہ آباد میں ٹیچری کرتے رہے۔ پڑھانا محض ذریعۂ معاش اور پیشہ نہ تھا۔ بلکہ تدریس سے ایک فطری دلچسپی رکھتے تھے اور اصول تعلیم پر مطالعہ خوب وسیع رکھتے تھے۔ پھر پہلے ہندو کالج میں اُردو کے لکچرر ہو گئے۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں منتقل ہو آئے اور پھر یہیں سے یورپ گئے۔ دو تین سال بعد پیرس سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور ڈی۔ لٹ کی اعلیٰ ڈگریاں لے کر الہ آباد واپس آئے۔ اور کوئی پندرہ سولہ سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہو کر مستقل قیام الہ آباد ہی میں کر دیا۔ کئی سال تک برابر ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) کا کام بڑے انہماک سے کرتے رہے اور ایک مدت تک اس کے جائنٹ سکریٹری (شعبۂ اُردو کے) رہے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق ہمیشہ رہا۔ اور ایک اچھا خاصہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں کا جمع کر لیا تھا۔ کلیات بحری (دکنی) کو ایڈٹ کیا۔ اور ایک کتاب گوتم بدھ پر لکھی اور ایک کبیر پر۔ اُردو سے زیادہ مشق انگریزی لکھنے کی تھی۔ اُردو میں مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ انگریزی میں مستقل مضمون نگار روزنامہ لیڈر (الہ آباد) کے تھے اور مستقل تبصرہ نگار روزنامہ ہندو (مدراس) کی یونیورسٹیوں میں اُردو کے ممتحن رہتے تھے۔ انگریزی میں تھیاسوفی کے موضوع پر ان کے رسالے اور مقالے بار بار چھپے۔ یوم النبی وغیرہ کے موقعوں پر سیرۃ النبی پر بھی لکھتے رہے۔ اور برسوں مستقلاً یہ بھی جاری رہا کہ اُردو پریس کے اچھے اچھے نوٹ ترجمہ کر کے انگریزی میں دیتے رہے۔

ملنے والوں، دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ اور یہ ہر ایک کا کام کر دینے کو ہر وقت تلے رہتے۔ سب کی خدمت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ دوسروں کی مالی مدد بھی کرتے رہتے اور اپنے اثر و رسوخ سے تو بہتوں کا کام نکال دیتے۔

صحت نوجوانی کے زمانے سے خراب تھی۔ اور اب تو ادھر کئی سال سے بہت زیادہ بیمار رہنے لگے تھے۔ کہنا چاہیے کہ نیم معذور سے ہو کر رہ گئے تھے۔ آنکھوں کی طرف سے مایوس و مجبور ہو کر وہ ابھی تین ہفتے ہوئے سیتا پور کے مشہور شفاخانۂ امراض چشم میں آنکھ بنوانے کے لئے گئے۔ آنکھ [illegible] ہو چکی تھی کہ [illegible] وقت مقرر آ گیا۔ ۱۲ دسمبر جمعرات کو دل کا دورہ پڑا اور اسی بہانے داعی اجل کو لبیک کہا اور جنازہ الہ آباد لایا گیا۔

(صدق جدید)

### ضروری گذارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور رسالہ بنام جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے پتہ پر فرمایئے

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا

# معاصرین

## اردو کانفرنس

آندھرا پردیش اردو کانفرنس کے سہ روزہ اجلاس سر زجیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اردو، عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، سری نواس لاہوٹی راجہ بہادر گوڑ اور دیگر کارکنان انجمن کی مسلسل انتھک اور پرخلوص کوششوں سے انتہائی کامیاب رہے۔ ان اجلاسوں میں تقریریں کرنے والے ادیبوں اور پروفیسروں نے اردو زبان کی افادیت، اہمیت اور صلاحیت کو جس شرح و بسط سے اپنے معلومات آفریں مقالوں کے ذریعہ پیش کیا، جس جوش اور خلوص سے لیڈروں نے اُردو کی ترجمانی کی، قرار دادوں کے محرکین نے جس سنجیدگی اعتدال اور دانش مندی سے قرار دادیں پیش کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آندھرا پردیش کے وزرا اور چیف منسٹر نے جس واضح انداز میں اس علاقائی اور دوسری اہم زبان اُردو کو پروان چڑھانے میں مدد دینے کا تیقن دیا۔ اس کے پیش نظر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اردو زبان نہ صرف ایک اہم معیاری اور زندہ زبان ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی نہایت خوش آئند ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کانفرنس کو منعقد کرکے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے جس کا سہرا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کے سر ہے۔

کانفرنس میں غیر مسلم مقررین کی اکثریت اور پُرجوش علمی تقریروں کے ذریعہ اردو زبان کی مدلل وکالت سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہر مذہب و طبقہ کا شخص اردو زبان کے عشق سے سرشار ہے اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے والہانہ جذبہ رکھتا ہے۔ اردو کا پلیٹ فارم قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کا بھی شاندار مظاہرہ کر رہا تھا جو یادگار رہے گا۔ ان بے نظیر مناظر کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو اتنی ہمہ گیر اور ایسی ہر دل عزیز ہوتے ہوئے بھی ان رکاوٹوں اور پریشانیوں سے کیوں دوچار ہے جس کا قراردادوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

اضلاع کے جن مندوبین نے کانفرنس کی روداد کا منظر بچشم خود دیکھا وہ مسرور بھی ہیں اور حیران بھی۔ اردو ہاں میں ادیب اس زبان کی تائید میں فصاحت کے دریا بہا رہے ہیں شعرا اس کی شیریں بیانی کے راگ الاپ رہے ہیں پروفیسر اس کی علمی صلاحیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ لیڈر اس زبان کے جذبۂ اتحاد کی بڑی جوش و خروش سے گواہی دے رہے ہیں اور وزرا گیسوئے اُردو کو آراستہ کرنے کا یقین دلا رہے ہیں۔ حیدرآباد کی فضاؤں میں اتنی سطح پر اردو ہی اردو چھائی ہوئی ہے۔ اس خوبصورت پودے کے حسین پتوں کو عطر پانی سے دھو کر اور نکھارا جا رہا ہے مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ ادھر دیہاتوں اور تعلقوں میں تحتانی و وسطانی مدارس سے اُردو کو غائب کر کے محکمہ تعلیمات کی قینچی اس پودے کی جڑوں کو چپکے ہی چپکے کاٹ رہی ہے چند دن بعد نتیجہ جو ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دستور نے اردو کو تسلیم کر لیا ہے۔ بیشک حکومت آندھرا پردیش نے اسے علاقائی اور دوسری اہم زبان قرار دیا ہے۔ یقیناً وزرا اور چیف منسٹروں نے تیقنات دیئے ہیں لیکن نچلی سطح پر جہاں اردو کی جڑ بنیاد ہے عملی طور پر جو کرشمہ سازیاں ہو رہی ہیں محکمہ تعلیمات کا نظم و نسق اردو جماعتوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے وہ بہت زیادہ مایوس کن اور انجمن ترقی اردو کی فوری توجہ کا طالب ہے اگر نیچے سے ابھر کر اُردو جاننے والے نہ آئیں ایک دن ایسا آئے گا جبکہ اردو ہال (خاکم بدہن) اردو جاننے والوں سے خالی رہے گا اور پروفیسر تاراچند، پروفیسر ہارون خاں شروانی، سری نواس لاہوٹی راجہ بہادر گوڑ، مشریدہ دیز، مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، خیرات ندیم اور مغنی تبسم کے شہکارات قلم اور افکار عالیہ عہد ماضی کی داستان بن کر رہ جائیں گے۔

یقیناً حکومت آندھرا پردیش کی پالیسی اردو کے تعلق سے نہ صرف ہمدردانہ بلکہ فیاضانہ ہے لیکن محکمہ تعلیمات کا نظم و نسق دیہاتوں اور تعلقہ جات بلکہ اضلاع میں مختلف بہانوں سے حکومت کی پالیسی، وزرا کے وعدوں اور عوام کی تمناؤں کے خلاف جا رہا ہے۔ اس لئے اردو ہال میں جو کچھ کہا گیا اس پر سکریٹریٹ کی کرسیوں کی بجائے دیہاتی مدارس کی چار دیواری میں عمل کرنے اور دیگر محکموں کے علاوہ سررشتہ تعلیمات کی کارگذاری پر کڑی نگرانی رکھنے کی ضرورت ہے۔

(رہبر۔ نظام آباد)

ڈاکٹر تارا چند صاحب ایم اے		گزشتہ سے پیوستہ

# اُردو مُشترکہ تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے

## (آندھرا پردیش اُردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت)

سامراج کے مطالبوں کا جواب ہو۔ ہندوستانیوں کی چھوٹ پڑی سامراج کا محل کھڑا ہو سکتا تھا، اور زبان اس کام میں مفید ثابت ہو سکتی تھی اس لئے اُردو کے مقابلے میں ایک ایسی ادبی بھاشا گڑھی گئی جس کا چوکھٹا تو اُردو ہے پر صورت کی رنگت ریکھا سنسکرت سے لی گئی۔ یعنی کھڑی بولی کے ادبی روپ اُردو میں سے فارسی لفظوں کا بہشکار کر کے سنسکرت کے واکیہ رکھ کر ہندی کو جنم دیا گیا۔ اب دو زبانیں چل پڑیں ان میں بھی کچھ عجیب نہ تھا۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی برج بھاشا اور فارسی تھیں اور بہت سے ہندو اور کافی تعداد میں مسلمان پڑھے لکھے دونوں سے واقف تھے۔ ایسے ہندو اور مسلمان ادیبوں کی لمبی فہرستیں بن سکتی ہیں۔

لیکن اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ انگریزی حکومت نے ۱۸۳۵ء میں یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری زبان انگریزی ہے اور سرکاری نوکری کے لئے اس کا جاننا لازم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو فارسی اُردو پڑھتے تھے اور دوسرے وہ جو سنسکرت اور ہندی۔ ان گروہوں میں ایسے بہت کم رہ گئے جو انگریزی کے علاوہ فارسی کے ساتھ سنسکرت اور اُردو کے ساتھ ہندی سے واقف ہوں۔ اُردو اور ہندی دو الگ الگ طبقوں کی زبانیں ہو گئیں۔ یہیں سے فرقہ وارانہ قضیہ کی داغ بیل پڑی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جھگڑے زور پکڑتے گئے۔ انگریزی سوداگر اور ہندوستانی بے عقلی نے بیر کی آگ کو ہوا دی۔ اُردو تیزی کے ساتھ ایران کی طرف راغب ہوئی اور ہندی ماضی کی طرف چلی۔ ۱۹۱۸ء میں گاندھی جی نے کوشش کی کہ ان دونوں کو لوٹائیں اور ایک ڈگر پر چلائیں۔ لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ملک کا بٹوارہ ہوا اور ہندوستانی دو قوموں میں تقسیم ہو گئے۔

اب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار پائے لیکن ہمارے رہنماؤں نے ایسی کٹھن حالت میں بھی جب کہ جذبوں کے سُرخ شعلے لپک لپک کر آسمان تک پہنچ رہے تھے، ٹھنڈے دل سے کام لیا۔ ملک کے آئین میں اُردو کو قومی زبانوں کی فہرست میں شامل کیا اور زبان کے متعلق خاص ہدایتیں دیں۔ اول تو یہ کہ ہر شخص قومی زبانوں میں سے جس میں چاہے اپنی شکایتیں سرکاری افسروں کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے ہر صوبہ کے لئے واجب قرار پایا کہ ابتدائی تعلیم بچوں کی مادری زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ تیسرے یہ کہ ایک خاص افسر اس غرض سے مقرر کیا جائے کہ وہ اقلیتوں کی زبان کے متعلق جانچ کرتا رہے اور ان معاملات کے بارے میں ری پبلک کے صدر کو رپورٹ دیتا رہے۔ سب سے اہم یہ تجویز کی کہ ہندی کے نشو و نما میں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا لحاظ ہو اور ہندی کی بناوٹ میں ہندوستانی کے روپ ڈھنگ اور سانچے سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو جو چودہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے کس حیثیت کی مالک ہونی چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُردو کو کسی زبان سے دو دو نہیں ہے۔ اُردو اور ہندی کے تعلق کو لیجئے۔ کچھ زبانوں کے ماہر اُردو کو ہندی سے الگ مانتے ہیں اور کچھ سیاسی لوگ بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے آئین میں اُردو کو ہندی، بنگلہ، تامل وغیرہ زبانوں کے ساتھ ایک جداگانہ مستقل زبان مانا ہے ظاہر ہے کہ بنگلہ، تامل، تلگو، مراٹھی زبانوں کی ہندی سے کوئی رقابت نہیں نہ صرف یہ کہ ان کی ترقی ہندی کے راستے میں حائل نہیں بلکہ ان کی ترقی کے ساتھ ہندی کی ترقی وابستہ ہے۔ جتنی ہی ان زبانوں کی جڑیں مضبوط ہوں گی، ہندی کی نشو و نما میں مدد ملے گی۔ ہندی کے دباؤ کا ڈر کم ہو گا اور اس کی قدر بڑھے گی۔ ہندی کا سرکاری زبان کا مرتبہ عام ہندوستانیوں کے احترام اور اتفاق ہی پر قائم رہ سکتا ہے۔ اس میں زور اور زبردستی سے بجائے فائدے کے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اس میں تو کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ ہندی سارے ہندوستان کے ہر صوبہ میں اور ہر کونہ میں پھیلے گی۔ کل ہند کی سرکاری کاروبار کی زبان ہو گی اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ کسی دوسری ہندوستانی زبان پر یہ ذمہ داری نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر کیوں کسی کے دل میں یہ شک ہو کہ اُردو کی وجہ سے ہندی پر آنچ آ سکتی ہے۔ جب اُردو پڑھنے والوں کے لئے بھی ہندی جاننا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اُردو زبان والوں کے لئے تو ڈر کس بات کا ہے۔ لیکن دیکھتے ہیں یہ آتا ہے کہ کچھ ہندی والے طبقوں میں اُردو کے نام سے گھبراہٹ اور کھلبلی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں یہ بالکل بے بنیاد ہے۔

ہندی والوں کا ایک اور فریق ہے جو ہندی اور اُردو کو کھڑی بولی کے دو روپ سمجھتا ہے اور ان دونوں میں کوئی گہرا فرق نہیں محسوس کرتا۔ لیکن عمل ان کا بھی ویسا ہی ہے جیسے پہلے فریق کا۔ یہ لوگ ہندی کے گلدستے اور انتخاب تیار کرتے ہیں اور انھیں اسکولوں میں رائج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان انتخابوں میں ہندی کے سب اسٹائل شامل ہونے چاہئیں۔ پھر تعجب کی بات ہے کہ برج بھاشا اور اودھی سے تو ٹکڑے لئے جاتے ہیں پر کھڑی بولی اُردو سے شاید ہی نثر یا نظم کا کوئی ٹکڑا لیا جاتا ہو۔ ہندی کے ایک اسٹائل سے اتنی محبت، اور دوسرے سے اتنی بے اعتنائی آخر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اُردو اور ہندی والوں کی ریڈروں میں کھڑی بولی کے دونوں روپوں کا عکس آنا چاہئے۔

اس سلسلے میں گورنمنٹ کے رویہ پر غور کرنا لازم ہے۔ آئین کیا چاہتا ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں۔ مرکزی گورنمنٹ نے بھی اپنا عندیہ بہت حد تک صاف کر دیا ہے۔ ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو ہوم منسٹری کی جانب سے جو پریس نوٹ چھپا تھا اس میں گورنمنٹ کی پالیسی کی تشریح اور اُردو کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہیں، ان کا جواب ہے اور بتایا ہے کہ کن علاقوں کی اُردو مادری زبان ہے۔ شمالی ہند میں کافی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں جموں اور

کشمیر میں سیاہ ہری زبانوں میں اس کی گنتی ہے۔ آندھرا پردیش کے تلنگانہ حصہ میں یہی زبانوں میں شامل ہے۔ دہلی، پنجاب، اتر پردیش اور بہار خاص علاقے ہیں، جہاں بہت سے لوگوں میں اس کا چلن ہے اور دہلی اور لکھنؤ اس کے مرکز رہے ہیں۔ اُردو زبان کا خاص ادبی مذاق ہے جس میں بڑی جان ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کو فروغ دیا جائے۔ سفارش یہ ہے کہ جن بچوں کے والدین اپنے بچوں کی تعلیم اردو کے ذریعہ دلانا چاہتے ہیں، ان کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ثانوی درجوں میں بھی اُردو پڑھانے کا بندوبست ہو۔ کچہریوں اور دفتروں میں اُردو کی عرضیاں اور مراسلے قبول کئے جائیں اور اہم قانون اور قاعدے اردو زبان میں چھاپے جائیں۔

۲۶ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء میں ہوم منسٹری کا دوسرا پریس نوٹ شائع ہوا جس میں سنہ ۱۹۵۸ء کے نوٹ کی طرف چیف کمشنر دہلی کی توجہ دلائی گئی اور کہا گیا کہ مرکزی حکومت دہلی کے علاقہ کے لئے اُردو زبان کو خاص اہمیت دیتی ہے اور خواہش کرتی ہے کہ خاص کاموں کے لئے اُردو کا استعمال ہو۔

ایک سال بعد سنہ ۱۹۶۱ء کی دس گیارہ اور بارہ اگست کی تاریخوں میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے وزیروں کا اجلاس ہوا جس کے سامنے قومی ایکتا کا اہم سوال رکھا گیا۔ زبان کے معاملہ پر بھی خاص توجہ دی گئی اور ان اصولوں پر اتفاق ہوا۔

(۱) کم گنت گروہوں کا حق ہے کہ پہلے درجوں کی شکشا ان کی مادری زبان میں دی جائے۔

(۲) نچلے درجوں میں آئین کی آٹھویں فہرست میں جن باتوں کا ذکر ہے تعلیم کا ذریعہ مانی جائیں۔

(۳) نچلے درجوں کے دو بار طبقوں کے لئے یہ طے ہوا کہ ہر ایک کو تین زبانیں جاننا لازم ہے۔ اول اپنے علاقے کی زبان یا مادری زبان۔ دوم ہندی یا ہندی بھاشائی علاقوں میں کوئی دوسری ہندوستانی زبان اور تیسری انگریزی یا کوئی اور یوروپی زبان۔

وزیروں نے اس بات پر بھی دھیان دیا کہ ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں نہ رائج ہوں اور اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کم گنت لوگوں کی زبانوں سے بھی کام لینا ضروری ہے۔ اگر کسی ضلع میں ساٹھ فی صدی آدمی ایسی زبان بولتے ہیں جو اس صوبہ کی زبان نہیں ہے تو ضلع کے لئے اسے سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہئے اور کسی تحصیل یا میونسپلٹی میں پندرہ فی صدی کی کم گنت آبادی ہو تو وہاں بھی اس آبادی کی زبان میں اہم سرکاری قانونوں اور قاعدوں کو چھاپنا چاہئے۔ زبان کے لحاظ سے کم گنتوں کے حقوق کی حفاظت کی نہایت زور کے ساتھ تائید کی اور قومی ایکتا کے سوال کو اول درجہ کی اہمیت دی۔

معذرت

[illegible]

جہاں تک قرار دادوں کا تعلق ہے معاملہ بالکل صاف ہے۔ کاغذی کارروائیوں میں کوئی کسر نہیں۔ کمی ہے تو عمل کی اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ ہماری صوبائی حکومتوں کا فرض ہے کہ ان تجویزوں پر جلد عملدرآمد کریں۔ مگر بھولنا نہیں چاہئے کہ قانون کا یہ مطالبہ ہے۔ آئین کا حکم ہے اور مرکزی اور صوبائی وزیروں کا یہی فیصلہ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ملک کی شانتی اور بیرونی کشمکش کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے اگر قوم کو ایکتا اور محبت کے رشتوں میں جوڑنا ہے تو لازمی ہے کہ ہر گروہ کے قانونی حقوق کی ہمدردی کے ساتھ حفاظت کی جائے، شکوہ اور شکایت کے دروازے بند کئے جائیں۔ باہمی اعتماد اور سمجھوتے کی بنیادوں پر ایک شاندار قومی محل زمانہ کے مخالفانہ حملوں کا ہمیشہ ہمیشہ مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو۔

اُردو کے حامیوں سے میری یہ درخواست ہے کہ اس مسئلہ پر غور کریں کہ اُردو جو تیرہ اور زبانوں کے ساتھ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہے کس طرح اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہے۔ ہر قومی زبان کا تعلق تمام قوم کے ساتھ علاقہ ہے اس لئے چودہ زبانوں سے ہر ایک کا یکساں فرض ہے کہ ایک ہندوستانی قومیت کے اظہار کا ذریعہ بنے۔ قومیت اس سماجی شعور کا نام ہے جو قوم کے فردوں کے ذہنوں میں اپنے اور پرائے کی تفریق جگاتا ہے۔ قوم کو خودی کا پرجوش احساس عطا کرتا ہے۔ غیر قوموں کی اجنبیت سے آگاہ کرتا ہے۔

قومی زبانوں سے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ قومی شعور کو تیز کریں تاکہ قومی اتحاد مضبوط سے مضبوط تر ہو۔ زبان ایک طرح ہمارے دلوں کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف دلی کیفیت کی قدروں، جذبوں کی گہرائیوں اور زندگی کے نصب العین کو قائم کرتی ہے۔ قومیت کا خیالات سے، اخلاق سے، تاریخ سے گہرا رشتہ ہے۔ خیالات اسے آئندہ کا نقشہ دکھاتے ہیں۔ اخلاق موجودہ زندگی کی سیدھی راہوں پر چلاتا ہے۔ تاریخ اس کا حافظ ہے جو قوم کے تسلسل اور قوم کی انفرادیت کو اپنے میں سمیٹتا ہے۔

اگر ان معنی میں اُردو زبان کو اس مرتبہ پر لانا ہے کہ وہ کل قوم کے لئے بلا لحاظ مذہب و ملت فخر کا باعث ہو سب ہی اسے اپنائیں، سب کے دلوں میں اس کی عزت اور محبت ہو۔ اُردو زبان اور اُردو ادب کے رنگ روپ کی گہری جانچ کرنی ہوگی۔ ہمیں ہندی کی موجودہ رفتار سے سبق لینا چاہئے۔ ہندی تیزی کے ساتھ خواص کی کتابی زبان بن رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بنانے والے زبانوں کی تاریخ اور زبانوں کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ انھیں بے جان کاغذ اور قلم سے واسطہ ہے۔ خشک ڈکشنریوں اور اصطلاح کے لمبے ستونوں سے پرہم ہے۔ شاید بھول گئے ہیں کہ زبان ایک جیتی جاگتی بہاد پھرتی جیب ہے اور ہونٹوں سے نکلے شبدوں کی دھارا ہے جو دلوں کے راستے ذہنوں میں ڈوب جاتی ہے اور ہماری اندرونی دنیا کو روشنی کی کرنوں سے جگمگاتی اور جذبے کی لہروں سے تڑپاتی ہے۔

اُردو ایسی زبان ہونی چاہئے جسے زیادہ سے زیادہ لوگ وہ بھی جنھوں نے تھوڑی تعلیم پائی ہے یا تعلیم سے بے بہرہ ہیں اور وہ بھی جن کی عمریں مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں گذری ہیں سمجھ سکیں اور اس سے لطف اٹھا سکیں۔

(باقی)